چند روز جاپان میں

مذہب و امن پر دوسری عالمی کانفرنس

(۳)

از سعید احمد اکبر آبادی

اس کے بعد پروفیسر آر ۔ جے ۔ وربلوسکی (R.J. ZWI WERBLOWSKY) نے اپنا مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا: "گویم مشکل نگویم مشکل": مذہب، امن اور انسانی حقوق پر ایک نظر" موصوف یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے پروفیسر تھے۔ میں نے موصوف کی تقریر کو وہاں بھی غور اور توجہ سے سنا اور پھر اس کو پڑھا بھی۔ لیکن مجھ کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں اور ان کا مرکزی نقطۂ خیال کیا ہے۔ تقریر میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ تھی اور تشکیک کا انداز تھا۔ ممکن ہے اس میں دخل ان حالات کا ہو جن میں عربوں کے ساتھ جنگ کے باعث ان کا ملک اسرائیل گرفتار ہے۔ چونکہ تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے اور اسی سے خود ارباب مذاہب کو احتساب نفس کا موقع ملے گا اس لئے ہم جستہ جستہ اس تقریر کے بھی اقتباسات نقل کرتے ہیں

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

موصوف نے اوّل تو یہ کہا کہ یوں تو جب امن کی بات چھڑتی ہے ہر مذہب دعویٰ کرتا ہے کہ انسانی اخوت و برادری، انسانی مساوات اور امن کا بڑا حامی ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے مذہب کے لوگوں نے صرف دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ ہی نہایت سخت اور لڑائیاں نہیں لڑی ہیں، بلکہ آپس میں بھی جنگ کرتے رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بھائی نے بھائی کے خلاف، بھتیجوں نے چچا کے خلاف اور بیٹے نے باپ کے خلاف نبرد آزمائی کی ہے۔ پھر

یہ باتیں تو گذشتہ زمانہ کی تھیں۔ آج بھی ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب والوں پر بلکہ اہل مذہب آپس میں ایک دوسرے پر جو قیامتیں ڈھارہے اور مصیبتیں لارہے ہیں وہ کیا کچھ کم ہیں۔؟
اہل مذاہب کو اس پر شرم آنی چاہئے کہ انسانی مساوات، انسان کے احترام۔ اور غریبوں کی امداد واعانت کے جو کام ان کے مذاہب کی اعلیٰ تعلیمات میں شامل ہیں۔ آج ان کاموں کی تکمیل یا ان کے لئے جدوجہد وہ قومیں کر رہی ہیں جو مذہب کی قائل نہیں ہیں اور جو خدا پر عقیدہ نہیں رکھتی ہیں جب ایک ہی مذہب کے لوگوں نے باہم رواداری کا معاملہ نہیں کیا تو آج اس بات کی امید کیوں کر ہو سکتی ہے کہ ایک مذہب دوسرے مذاہب کے ساتھ قیام امن کی کوششوں میں دل سے اشتراک وتعاون کرے گا۔ حالت تو یہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا سہرا صرف عیسائیت کے سر باندھتا ہے وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ اچھا اور نیک کام دوسرے مذاہب کی بھی تعلیم ہے۔ یہی حال ہندؤں، مسلمانوں، یہودیوں اور دوسرے مذہب کے لوگوں کا بھی ہے۔ پس جب آپ لوگ مذاہب عالم کی مشترک قدروں کی اس حیثیت کو بھی کھلے دل سے ماننے کے لئے تیار نہیں اور ہر بات میں آپ کو اپنے مذہب کی ہی فوقیت کا خیال رہتا ہے تو اب یہ توقع کیوں کر ہو سکتی ہے کہ کیوٹو کی اس کانفرنس میں بیٹھتے ہی آپ کی صدیوں کی بنی بنائی عادتیں اور طبیعتیں اچانک بدل جائیں گی اور آپ دوسرے مذہب کو وہ مرتبہ ومقام دینے پر رضامند ہو جائیں گے جو آپ اپنے مذہب کو دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں موصوف نے یہ بھی کہا کہ آپ امن کو ایک منفی حقیقت NEGATIVE FACT مانتے ہیں یعنی آپ کے نزدیک امن کے معنی ہیں "جنگ نہ کرنا" حالانکہ امن۔ ایک ایجابی (POSITIVE) حقیقت ہے۔ ایک ظالم اور ڈاکو کے خلاف جنگ کرنا بھی درحقیقت حصول امن کی ایک صورت ہے۔ جس طرح بیماری، غربت، جہالت اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنا عین امن ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے اس پر زور دیا کہ اہنسا یا ستیہ گرہ جس کو گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کے لئے استعمال کیا صرف ایک وقتی حربہ ہو سکتا ہے اور کامیاب ہو سکتا ہے

لیکن اس کو مستقل عقیدہ یا پالیسی نہیں بنایا جاسکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کہتے ہیں کہ "امن کی جگہ انسان کا دل ہے اس لئے اس کو بدل ہی کر امن قائم کیا جاسکتا ہے۔" لیکن میں پوچھتا ہوں کہ دلوں میں تبدیلی کس طرح پیدا ہوگی؟ ہمارے زمانہ کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات نے ہمارے دل و دماغ پر جو قبضہ کر رکھا ہے جب تک آپ ان کو نہیں بدلیں گے اس وقت تک یہاں بیٹھ کر تقریریں کرنے اور چند تجاویز پاس کر دینے سے تو دل نہیں بدل جائیں گے۔ اور سیاست، معاشیات اور سماجیات پر قبضہ ان لوگوں کا ہے جو ارباب مذہب (RELIGIONISTS) کی صف میں شامل نہیں ہیں۔ تو پھر مجھ کو بتایئے کہ ان لوگوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر یہ دلوں میں تبدیلی کی راہ کس طرح ہموار ہوگی اور آپ کی اس کانفرنس کا نتیجہ کیا نکلے گا!! بہرحال میرے خیال میں ضروری ہے کہ ارباب مذہب اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں۔ بلکہ اگر ان کو واقعی دنیا میں امن قائم کرنا ہے تو دو باتیں بہت ضروری ہیں: (۱) ایک یہ کہ وہ خود ایماندار، قول کے سچے اور عمل میں راست باز بنیں اور وہ ہرگز کسی بڑی سے بڑی حکومت و طاقت کو اس کی اجازت نہ دیں کہ وہ ان کے مذہب کو سیاسی، استعماری یا کسی اور مقصد کے لئے استعمال کریں۔ دل میں صفائی اور پاکیزگی پیدا کریں اور ایک دوسرے کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دیں (۲) علاوہ ازیں دوسری بات یہ ہے کہ آج سیاسیات اور معاشیات پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ خدا پرست ہوں یا خدا کے منکر! بہرحال ان سے ربط پیدا کریں۔ ان کا اشتراک اور تعاون حاصل کریں۔ کیوں کہ آپ حضرات خواہ کچھ کہیں امن ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اس کا حل سیاست کی راہ سے ہی ہو سکتا ہے، محض مذہب کی تعلیمات بیان کر دینا اور اخلاق پر لکچر دیتے رہنا اور وعظ و نصیحت کے گھونٹ لوگوں کے حلق سے نیچے اتارتے رہنا نہ قیام امن کی ضمانت ہیں اور نہ دنیا سے موجودہ شر و فساد کے خاتمہ کی دلیل!!

موصوف نے جو کچھ کہا تھا اس کا ثبوت ہاتھ کے ہاتھ اس طرح بھی مل گیا کہ کانفرنس میں جب تجاویز کی نوبت آئی تو ایک مسلمان عرب جو بیروت کے نمائندہ تھے انھوں نے اپنا

غرض سمجھا کہ چونکہ موصوف یہودی ہیں اور اسرائیل سے آئے ہیں اس لئے ان کی ہر بات کی تردید کی جائے اور وہ بھی نہایت تند و تیز اور تلخ و ترش الفاظ میں ! چنانچہ ان دونوں حضرات کی لفظی معرکہ آرائی کے باعث کانفرنس ہال کچھ دیر کے لئے رزم کا میدان بن گیا ۔

چند اور مقالات | اس مقالہ کے علاوہ چند اور مقالات جو کانفرنس میں پڑھے گئے ان کی روداد بغیر ترتیب کے یہ ہے :

(۱) آرک بشپ ہیلڈر کمارا (HELDER CAMARA) برازیل (جنوبی امریکہ) میں کیتھولک چرچ کے آرک بشپ ہیں ۔ اور اپنی حق گوئی مظلوموں کی حمایت اور انصاف پسندی کے لئے عالمگیر شہرت کے مالک ہیں ۔ یہ اسٹیج پر آئے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔ انھوں نے " مذاہب اور دنیا میں تعمیری تبدیلیوں کی ضرورت " کے زیر عنوان اپنا مقالہ پڑھا ان کے لب و لہجے میں بڑا جوش و ولولہ اور عزم و حوصلہ تھا ۔ انھوں نے سب سے پہلے تو اس امر کو خدا کا منشا اور اس کی قدرت بتایا کہ آج تمام مذاہب کے لوگ اختلافات مذہبی کے باوجود ایک نہایت عظیم اور مشترک مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں ۔ ورنہ اب سے چند برس پہلے اس نوع کی کسی کانفرنس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا یہاں کوئی شخص کسی غیر مذہب والے کو اپنا ہم مذہب بنانے کے جذبہ سے نہیں آیا بلکہ آج خود انسان کے وجود اور اس کے بقا کو جو عظیم خطرہ لاحق ہے ۔ ہم میں سے ہر ایک اس کو شدت سے محسوس کر رہا ہے ۔ اور چونکہ یہ خطرہ مشترک ہے اس لئے اس کے شدت احساس نے ہم سب کو ایک جگہ لا بٹھایا ہے ۔ اس کے بعد موصوف نے دنیا کے موجودہ حالات اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ : آج بڑی اور چھوٹی طاقت ور اور کمزور قوموں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی قومیں اپنی طاقت و قوت اور دولت و ثروت کے نشہ میں سرشار ہیں اور اس سرشاری کے عالم میں وہ چھوٹی ، غیر ترقی یافتہ اور کمزور قوموں اور ملکوں کو لوٹنے کھسوٹنے اور معاشی استحصال

بالجبر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ہیں۔ ان قوموں کا حربہ یہ ہے کہ وہ خام پیداوار سستے داموں انہیں غیر ترقی یافتہ ملکوں سے حاصل کرتی ہیں اور پھر اسی خام پیداوار سے اپنے مصنوعات بنا کر ان کمزور ملکوں کے ہاتھ فروخت کرتی ہیں اور ان کے منھ مانگے دام حاصل کرتی ہیں۔ یہ سارا کھیل بڑی اور متمول قومیں صنعت و حرفت اور سائنس و ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی یافتہ ہونے کے سہارے کھیل رہی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدم و حوا کی اولاد اور ایک ہی خدا کی مخلوق ہونے کے باوصف قوموں اور قوموں کے درمیان بعد و افتراق کی مسافت دراز تر ہوتی جارہی ہے۔ اس چیز کو خوب وضاحت سے اور کھل کر بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ اہل مذاہب کو ہرگز اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض ایک اقتصادی یا تجارتی معاملہ ہے اور اس بنا پر مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ لوگوں میں خود غرضی، نفع اندوزی اور منفعت نفس کا جذبہ اس حد تک قوی ہو گیا ہے کہ ان کا ایمان مغلوب ہو گیا ہے اور اس کے باعث اخلاق فاسد اور خراب ہو گئے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر اہل مذاہب کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اس صورت حال کو بدلیں اور انسان اخلاقی انحطاط کے قعر عظیم میں گر کر اپنے جس شرف و مجد سے محروم ہو گیا ہے وہ اس کو واپس دلائیں۔ اس فرض کو ادا کرنے کے لئے سب سے مقدم اور ضروری امر یہ ہے کہ اہل مذاہب نڈر اور بے خوف ہو کر اپنے اپنے ملکوں اور قوموں کا جائزہ لیں اور جہاں اور جس شکل میں بھی انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں انصاف نہیں ہو رہا ہے اور ظلم و عدوان کیا جا رہا ہے چاہے وہ خود ان کا اپنا ملک، ان کی اپنی قوم اور ان کی اپنی گورنمنٹ ہو بہر حال مذہب کے حاملین اور اس کے علمبرداروں کو اس کے خلاف موثر احتجاج کرنا چاہئے اور اس راہ میں نہ کسی کی رو رعایت ہونی چاہئے اور نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کا اندیشہ! (گویا موصوف نے وہی بات کہی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں اسلام کی تعلیم ہے) اگر ہم میں سے ہر شخص اس کانفرنس سے یہ عہد کر کے جائے کہ وہ اپنے ملک میں اس فرض کو دلیری اور بے خوفی سے انجام دے گا تو صورت حال بہت کچھ

بدل سکتی اور دنیا کا رخ پلٹ سکتا ہے۔ سلسلہ تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں بحیثیت عیسائی کے اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ دنیا کی دولت اور اس کے ذرائع پیداوار پر آج دنیا کی آبادی کے بیس فیصد جن لوگوں کا قبضہ ہے اور جن کے اس قبضہ کے باعث اسّی فیصد انسان محرومی اور مایوسی کا شکار ہیں۔ یہ بیس فیصد خود غرض اور بد دیانت انسان کم از کم اپنی اصل کے اعتبار سے عیسائی ہیں۔

ترقی | (۲) ایک اور اہم اور پر مغز مقالہ "ڈاکٹر یوجن کارسن بلیک (DR. EUGENE CARSON BLAKE —) کا پڑھا گیا۔ موصوف امریکہ کے ورلڈ کونسل آف چرچیز کے سکریٹری جنرل ہیں۔ انھوں نے شروع میں کہا کہ ہماری اس کانفرنس نے یہ طے کیا ہے کہ اس کے خاص موضوعِ بحث یہ تین امور ہوں گے: (۱) انسانی حقوق۔ (۲) ترقی اور (۳) تخفیف اسلحہ ہیں۔ اپنے مقالہ میں ترقی (DEVELOPMENT) پر گفتگو کروں گا۔ اس سلسلہ میں جو امور میرے موضوع بحث ہوں گے وہ یہ ہیں:

(الف) ترقی کا مقصد اور اس کا لائحہ عمل۔

(ب) ترقی اور امن میں رابطہ۔

(ج) ترقی اور مذہب میں رابطہ۔

(د) ترقی کے جذبہ کی تسکین کے لئے مذاہبِ عالم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

ترقی کا مقصد اور اس کا لائحہ عمل | ترقی (DEVEOPMENT —) کا لفظ آج کثرت سے بولا اور لکھا جاتا ہے کہ مختلف لوگ اس کو مختلف معانی میں استعمال کرتے ہیں لیکن ہم عیسائیوں کے ہاں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے .... ایک خاص معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی سال (۱۹۷۰) جولائی کے مہینہ میں ٹوکیو میں ترقی پر بحث کرنے کے لئے ایشیا کے عیسائیوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں ترقی کی تعریف یہ کی گئی تھی "خدا کے منشا اور اس کے حکم کے مطابق اشخاص وافراد اور اقوام وملل کے لئے اپنی انسانی صلاحیتوں اور استعداد سے

زیادہ کام لینے اور انہیں کار آمد بنانے کے آزادانہ مواقع فراہم کرنا (LIBERATION, JUSTICE, DEVELOPMENT) —— صفحہ ۱۔ میرے خیال میں "آزادانہ مواقع" کے الفاظ بہت اہم ہیں۔ کیوں کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان سماجی، معاشی اور سیاسی اداروں کو یکسر بدل دینا ہے جو انسانوں کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ اور جبر و ظلم کا معاملہ کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا تعریف سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "ترقی" کے مفہوم میں صرف مادی پیش قدمی داخل نہیں ہے بلکہ اسے ہمہ جہتی ہونا چاہئے یعنی صحیح معنی میں ترقی کا وجود اس وقت پایا جائے گا جب کہ انسان مادی پیش رفت کے ساتھ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بھی آگے بڑھے گا۔ اس بنا پر جب ہم کسی ملک کی ترقی کا جائزہ لیں تو قومی آمدنی صنعت و حرفت اور پیداوار وغیرہ کے علاوہ ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اخلاق اور روحانیت کے اعتبار سے اس ملک کی حالت کیا ہے۔

اب ہم ترقی کی اس تعریف کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں تو اس وقت یہ ترقی ہم کو دنیا کے کسی ملک میں بھی نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ملک بملک اس کے وجوہ و اسباب مختلف ہیں۔ غیر ارادی غربت و افلاس ترقی کے فقدان کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اس بنا پر ترقی کا ایک بڑا اور بنیادی مقصد اس مصیبت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہونا چاہئے کیوں کہ غربت بذاتِ خود ایک لعنت اور مصیبت ہے لیکن درحقیقت سینکڑوں برائیوں گناہوں، بدکاریوں اور گمراہیوں کی جڑ اور سرچشمہ ہے لیکن اقتصادی مرفہ الحالی کے لئے کوششوں کے ساتھ سماجی اور دوسرے انسانی مقاصد کے لئے بھی جد و جہد ہونی چاہئے جیسا کہ ٹوکیو کی مذکورہ بالا کانفرنس میں اعلان کیا گیا تھا: "لوگ صرف غذا کے لئے جد و جہد نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ آزادی، شرف و مجد انسانی کا احترام اور مساوات بھی مانگ رہے ہیں" گذشتہ جنوری میں سوئٹزرلینڈ میں ورلڈ کونسل آف چرچیز کا عالمی مشاورتی جلاس ہوا تھا اس میں بھی یہ بات صفائی سے کہہ دی گئی ہے کہ "ترقی" کی ترکیب عناصر

ثلاثہ سے ہے: (۱) اقتصادی خوش حالی (۲) سماجی انصاف (۳) اور خود اعتمادی لیکن سماجی انصاف کو اس اعلان میں نمبر اوّل پر رکھا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

(FETTERS OF INJUSTICE P: 133)

میری رائے میں سماجی انصاف جو ترقی کی شرطِ اولین ہے اس کی قدر و قیمت صرف اخلاقی نہیں ہے بلکہ معاشی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ سماجی انصاف سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور اقتصادی فلاح و بہبود کے لئے خود اعتمادی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مسیحی نقطۂ نظر سے ہمارا یہ انتہائی ضروری اخلاقی فرض ہے کہ ہر انسان کے لئے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا بندوبست اور اس کے لئے مواقع فراہم کریں۔ آج کل معیارِ زندگی بلند ہو رہا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ کہاں پہنچ کر رکے گا۔ لیکن یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ ہر وہ ماحول جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے ساتھ استحصال بالجبر کا معاملہ کر رہا ہے وہاں ناانصافی پائی جاتی ہے جو سماجی انصاف کی ضد ہے۔ کمیشن نے بین الاقوامی ترقی پر جو رپورٹ مرتب کی تھی اس کے صفحہ ۱۲ پر درج ہے کہ ترقی کے گذشتہ بیس برس میں غریب ملکوں کی پیداوار میں پانچ فی صد کا اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس اضافے کے مطابق ان کو نفع بھی حاصل ہو سکا ہے۔ کیوں کہ ان ملکوں کی سرمایہ دار اقلیت نے اس پیداوار کو اپنی نفع اندوزی اور حرصِ جمع زر کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان ملکوں میں جو سرمایہ دار تھے وہ امیر سے امیر تر ہو گئے اور جو غریب تھے غریب تر ہو گئے اور عظیم تر اکثریت غریبوں کی ہے ان حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم (DISTRIBUTIVE JUSTCE ......) کا پروگرام بنانا ضروری ہے۔ یہ منصفانہ تقسیم جس طرح ایک اخلاقی مسئلہ ہے اسی طرح ایک اقتصادی مسئلہ بھی ہے چنانچہ مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر گنر مرڈل (GUNNER MYRDAL) جنہوں نے ایشیا کے غریب ملکوں کا اقتصادی جائزہ بڑی تحقیق اور دقت نظر سے لیا تھا۔ اپنی آخری کتاب (THE CHALLANGE OF WORLD POVERTY) میں لکھتے ہیں:

"غیر ترقی یافتہ ملکوں میں زیادہ سے زیادہ معاشی مساوات ان ملکوں کی اقتصادی خوش حالی کے لئے شرط اولین کی حیثیت رکھتی ہے" (ص ۵۴۳) پروفیسر پار مرجو ہندوستان کے مشہور ماہر اقتصادیات ہیں انھوں نے بھی مونٹرکس کی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ میں یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے ایشیا اور مشرق اقصی کے لئے مقرر شدہ اقتصادی کمیشن کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بھی اس بنا معاشی مساوات پر زور دیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیے: ECONOMIC BULLETIN FOR ASIA AND THE FAR EAST VOL. XIX NO. 1 JUNE, 1968 P. 58. بہر حال ترقی کے لئے انصاف کو شرط اولین قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سوسائٹی میں جو گروپ یا جو افراد و اشخاص خوش حال اور دولت مند ہیں ان میں اخلاقی قدریں بیدار ہوں گی اور وہ ملک کی ترقی کے منصوبہ میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک کر سکیں گے۔ کتاب PARTNERS IN DEVELOPMENT کے ص ۸ پر لکھا ہے۔

"جن لوگوں کے پاس دولت ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اس میں ان لوگوں کو شریک کریں جن کے پاس دولت نہیں ہے"[1] واضح رہے کہ میں نے یہ عبارت کسی مذہبی کتاب سے نہیں بلکہ پیرسن کمیشن کی سیکولر رپورٹ سے نقل کی ہے۔

ترقی اور امن کا باہمی رشتہ | میں نے ترقی کا جو مفہوم پیش کیا ہے جس کی رو سے سماجی انصاف اس کے لئے شرط لازم ہے وہ اگر آپ کی سمجھ میں آگیا ہے تو اب اس سے یہ بات خود بخود واضح ہوگی کہ ترقی اور امن کے درمیان کس قدر گہرا رابطہ ہے کیونکہ "امن" صرف ایک منفی حقیقت نہیں ہے جس کے معنی جنگ نہ کرنے کے ہوں بلکہ وہ ایک امر مثبت ہے اور اس کے معنی ہیں ایسے سماجی حالات پیدا کرنا جن کے باعث قومی یا بین الاقوامی سطح پر ایک قوم کے دوسری قوم سے۔ ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ اور ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ سے تعلقات خوشگوار ہوں اور کسی کو کسی کے خلاف

---

[1] اس کے ساتھ قرآن مجید کی یہ آیت بھی ذہن میں تازہ کر لیجئے " والذین فی اموالھم حق معلوم ۵ للسائل والمحروم ۵ اور دیکھئے کہ کیا یہ عبارت بالکل آیت کا ترجمہ نہیں ہے۔

غم وغصہ اور نفرت نہ ہو۔ ظاہر ہے جب انصاف ہوگا تو پھر تعلقات کی نوعیت بھی ہوگی اور اسی کے معنی امن ہیں۔ بائبل میں عبرانی زبان میں امن کے لئے " شلمون " کا لفظ بولا گیا ہے۔۔۔۔۔۔
ورلڈ کونسل آف چرچیز کی مشاورتی کمیٹی برائے امن وترقی کا اجلاس جو آسٹریلیا میں منعقد ہوا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں شلمون کی تعریف درحقیقت وہی بیان کی ہے جو میں نے اوپر امن کی عرض کی۔

مذہب اور ترقی میں رشتہ | بہت سے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ اس عام خیال کا باعث کارل مارکس کا یہ قول ہے کہ "مذہب افیون کی انٹی ہے" ہم اہل مذاہب کو چاہئے کہ اس طرح کی باتوں پر غم وغصہ کا اظہار کرنے کے بجائے یہ معلوم کریں کہ اس قسم کے خیالات کے اسباب کیا ہیں؟ ہمیں تنقید سے بددل ہوکر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ عام طور پہ جو مذہب رائج ہے خواہ وہ عیسائیت ہو، بدھ مت، ہندو مذہب ہو یا اسلام یا کوئی اور مذہب ہو اس نے ماضی قریب میں ان طاقتوں اور قوتوں کی تائید وحمایت کی ہے جو سماجی انصاف کی دشمن تھیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مختلف اسباب کے ماتحت سوسائٹی میں جو رسوم وعوائد قائم ہوگئے ہیں وہ چاہے مذہب کی اصل تعلیمات اور اس کی اسپرٹ کے کتنے ہی خلاف ہوں ان کو مذہب کے رہنماؤں اور علمبرداروں نے بھی سراہا ہے۔ پھر کیا یہ بھی واقعہ نہیں ہے کہ مذہب کے رہنماؤں کے قول وعمل میں بہت کم مطابقت رہی ہے۔ ان لوگوں نے خود تو دنیا کمانے اور جمع سیم وزر میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی لیکن لوگوں سے برابر دنیا کی برائیاں بیان کرتے اور اس سے الگ تھلگ رہنے کی نصیحت کرتے رہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اہل مذاہب نے شروع میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم اور سائنس کے ذریعہ دریافت شدہ بعض حقائق کی (جو اب ساری دنیا کے مسلمہ حقائق ہیں) سخت مخالفت نہیں کی اور ان لوگوں کی مخالفت کے باعث سائنس کے بڑے بڑے علماء اور محققین کو سخت مصائب وآلام کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟ میرے ان سوالات کا مطلب ہرگز یہ ثابت کرنا اور جتانا نہیں ہے کہ جی ہاں! مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے اس کے برخلاف میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مذہب "مستند ترقی" کا سب سے بڑا حامی اور مؤید ہے

لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنے کی یہ ہے کہ "ترقی انسان کے لئے ہے اور انسان ترقی کے لئے نہیں ہے" روحانی اور مذہبی اقدار کو زندگی کے کسی مرحلے اور کسی منزل میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "ترقی" کوئی بھی ہو۔ بہرحال کسی نظریہ اور کسی فکر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ اقدار ہوتے ہیں جن پر ترقی کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر یہ اساس روحانی اور مذہبی اقدار نہیں ہوں گے تو وہ اقدار ہوں گے جن کو موجودہ عہد کی فکری تحریکوں مثلاً سکولرزم، کیمونزم، سائنٹسزم، ہیومنزم، اور نیشلزم وغیرہ نے جنم دیا ہے لیکن اس صورت میں ترقی کا رخ غلط ہوگا اور وہ انسانیت اور انسان کیلئے آخر کار موجب ہلاکت و نقصان ہو گی۔ اور اس کے برخلاف اگر ترقی کی اساس روحانی اور مذہبی اقدار ہوئے تو مذہب اور ترقی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان سے انسانیت اور انسان دونوں کو فوز و فلاح نصیب ہوتے ہیں اور تہذیب و تمدن صحیح خطوط پر آگے بڑھتے ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے موضوع بحث کا چوتھا اور آخری جز خود بخود سامنے آتا ہے۔ یعنی یہ کہ ترقی کی راہ میں مذہبی طبقات کا کیا رول ہونا چاہئے۔ چنانچہ اب میں اس پر گفتگو کروں گا۔

ترقی کی راہ میں اہل مذاہب کا کردار اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی کی راہ میں اہل مذاہب بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر مذہب یہ چاہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک مسرور اور مطمئن زندگی بسر کرے اور وہ ان نعمتوں سے پورا فائدہ اٹھائے جو پروردگار عالم نے اس کے لئے پیدا کی ہیں اور ساتھ ہی انسان اپنے اس شرف و مجد کو برقرار رکھے جو بحیثیت انسان کے اس کا حق ہے۔ یہ جو ایک مقولہ ہے کہ "انسان فقط روٹی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا" اسکو زندگی سے فرار کا بہانہ نہیں بنانا چاہئے۔ مجھ کو یقین ہے کوئی مذہب یہ نہیں کہتا کہ غریبی اور احتیاج نظام قدرت کا ایک لازمی نتیجہ ہیں اور اس لئے انکو دنیا سے مٹانے کے لئے ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے، نہیں بلکہ مذہبی احکام کے ماتحت ہمارا فرض ہے کہ غریبی دنیا سے ختم کریں اور انسان کو معاشی فارغ البالی فراہم کریں۔ ہم کو یہ احساس اور یقین سوسائٹی کے خوش نصیب افراد میں پیدا کرنا ہے جو متمول اور دولتمند ہیں تاکہ وہ طنطنہ و طمطراق کے بجائے سادہ زندگی بسر کریں اور اپنی دولت کو ملک سے غریبی ختم کرنے کے کاموں میں صرف کریں۔

اس سلسلہ میں ہم کو کئی کام کرنے ہیں، ایک یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم نے جو مادہ پرستی پیدا کی ہے اور اس کی بنیاد پر جو ماڈرن سوسائٹیاں تعمیر ہو رہی ہیں ہم ان کے مقابلہ میں ایسی سوسائٹی پیدا کریں جو سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونے کے باوجود زندگی میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نہ رکھتی ہو لیکن اس کام کو انجام دینے کی غرض سے ہم کو خود مذہب کے بعض روایتی افکار و آراء اور اس کے رسمی رجحانات و عواطف پر نظر ثانی کر کے ان میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ بے شبہ یہ تبدیلی مذہب کے اصول اور اس کے بنیادی تصورات و تعلیمات میں نہیں ہوگی بلکہ صرف ان چیزوں میں ہوگی جو روایۃً مذہب سے منسوب رہی ہیں لیکن درحقیقت مذہب کی اساس سے ان کا تعلق نہیں ہے مجھے معلوم ہے کہ آج کل ہر مذہب میں نشأۃ ثانیہ کے لئے کام ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں مسلسل جد و جہد جاری ہے۔ یہ بات بڑی خوش آیند اور حوصلہ افزا ہے۔ دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ غریبوں اور امیروں دونوں طبقات سے ربط پیدا کر کے ہم اہل مذاہب کو انکی ذہنی تعلیم و تربیت کرنی چاہئے۔ امیروں کو ہم یہ بتائیں کہ ان کی دولت کا صحیح مصرف اور اسکے حصول کا جائز طریقہ کیا ہے اور غریبوں کو یہ سکھائیں کہ وہ اپنی غربت اور افلاس کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں ترقی کے متعلق ہمارا تصور نہ تو قومی اور وطنی ہونا چاہئے اور نہ فرقہ وارانہ بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی خاندان کے افراد سمجھ کر عالمی اور بین الاقوامی ہونا چاہئے۔ اسی بنا پر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی عظیم اکثریت اگر آج غریبی کا شکار ہے تو امریکہ اور یورپ کی متمول قوموں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان لوگوں کی غریبی کی مسئولیت ان پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ ان لوگوں کا جو غیر منصفانہ اقتصادی اور معاشی نظام ہے وہی اس کے لئے ذمہ دار ہے کہ امریکہ اور یورپ کی قومیں دولت اور ثروت میں اس قدر آگے نکل گئیں اور ایشیا اور افریقہ کی قومیں جو دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں وہ غربت و افلاس کا صید زبوں بن کر رہ گئیں۔ یہ صورت حال خدا کی مرضی اور اس کے حکم کے سرتاسر خلاف اور اس لئے عظیم ترین گناہ ہے۔ اب یہ ناقابل برداشت ہے۔ کیوں کہ اس سے انسانیت اور اس کی عظمت پامال ہو رہی ہیں۔ یہ صورتِ حال امن کے لئے عظیم خطرہ ہے اس ناانصافی اور اندھیر نگری کو جلد ختم ہونا چاہئے۔ (باقی)